

بیانیہ یا عملیہ

ہمارا طے شدہ موقف ہے کہ جو ریاست کسی دستور کے تحت رو بہ عمل ہے، یہی دستور اس کا ملٹی میٹاق اور بیانیہ ہوتا ہے۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ اس نے اپنی آخری کتاب قرآن کریم کی صورت میں قیامت تک کے لیے ایک دائمی بیانیہ جاری فرمادیا ہے، کیونکہ وہ عالم الغیب ہے اور اُسے ازل سے ابد تک ظہور پذیر ہونے والے حالات کا علم ہے۔ وہ انسانی فطرت، اس کی عقل اور حاجات و ضروریات کا جاننے والا ہے اور وہی بہتر جانتا ہے کہ انسان کے لیے نفع بخش کیا ہے اور نقصان دہ کیا ہے۔ انسان اپنی محدود عقل سے آنے والے لامحدود زمانے اور اُس کے تقاضوں کا ادراک نہیں کر سکتا۔ یہ امر بھی مسلم ہے کہ انسان ذاتی، گروہی اور طبقاتی مفادات کا اسیر ہوتا ہے، اس لیے اس کے فیصلوں میں نقص کا پیدا ہونا لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانوں کے بنائے ہوئے دساتیر اور قوانین میں حذف و اضافہ اور ترمیمات ہوتی رہتی ہیں۔

ملکی سرحدوں کے اندر دہشت گردی کا سلسلہ کم و بیش پندرہ سال سے جاری تھا، آرمی پبلک اسکول پشاور پر دہشت گردوں کے حملے نے اُسے ایک فیصلہ کن مرحلے میں تبدیل کر دیا اور اس کے نتیجے میں پارلیمنٹ میں نمائندگی رکھنے والی تمام جماعتوں نے سول اور دفاعی سٹبلشمنٹ کی مشاورت سے ”نیشنل ایکشن پلان“ ترتیب دیا، یہ بجائے خود ایک قومی دستور العمل تھا۔ لیکن لبرل میڈیا بلند آہنگ میں تسلسل کے ساتھ یہ راگ الاپتا رہا کہ نیا قومی بیانیہ آنا چاہیے۔ کچھ ایسا تاثر دیا جا رہا تھا کہ گویا مجوزہ نئے بیانیے کو فریم کر کے ہر جگہ آویزاں کر دیا جائے گا، دہشت گرد اسے دیکھتے ہی خوف زدہ ہو کر پلٹ جائیں گے اور راوی ہر سو چین لکھے گا، حالانکہ تبدیلی بیانیے سے نہیں آتی، عمل سے آتی ہے۔ ہم نے لمحہ موجود کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر بیانیہ مرتب کیا تھا، پھر اسے ذمے دار حلقوں کو دیا تاکہ وہ اس میں کچھ کمی یا اضافہ کرنا چاہیں تو بتا دیں اور اگر کسی بات کے بارے میں تحفظات ہیں تو اُس سے بھی آگاہ کریں۔ جب ایک عرصے تک کوئی جواب نہ آیا تو میں نے روزنامہ دنیا میں دو کالموں کی صورت میں اُسے شائع کر دیا۔ اتحادِ تنظیماتِ مدارس پاکستان کی پانچوں تنظیمات کے اکابر نے لفظ بہ لفظ پڑھ کر اس کی توثیق کی تھی۔

پھر اچانک پردہ غیب سے ”پیغامِ پاکستان“ کی صورت میں ایک نئی دستاویز سامنے آئی، اس دستاویز کی رونمائی کے لیے ایوانِ صدر میں ایک بڑی تقریب منعقد ہوئی اور بتایا گیا کہ اس کی ترتیب میں انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اور ہائر ایجوکیشن کمیشن کے زیر انتظام جامعات کی اجتماعی دانش شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسٹیج پر صدر مملکت کے دائیں بائیں وفاقی وزیر داخلہ احسن اقبال

وزیر خارجہ خواجہ محمد آصف کے علاوہ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کے ریکٹر پروفیسر ڈاکٹر محمد معصوم یاسین زئی اور ہائر ایجوکیشن کمیشن کے چیئرمین ڈاکٹر مختار احمد رونق افروز تھے۔ اتحاد تنظیمات مدارس پاکستان کی قیادت اور دیگر علمائے کرام سامعین کی صفوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ استقبالیہ کلمات میں یہ بھی بتایا گیا کہ اس دستاویز کی تیاری میں جناب احسن اقبال کی سرپرستی اور آشیر باد بھی شامل رہی ہے۔ ہائر ایجوکیشن کمیشن کے چیئرمین جناب ڈاکٹر مختار احمد نے اپنے خطاب کے دوران فخریہ انداز میں کہا کہ مولانا فضل الرحمن کہیں تو ہم کشمیر کمیٹی کا کام بھی کر کے دے سکتے ہیں۔ گویا ایک دستاویز مرتب ہوگی، اُسے پڑھ کر بھارت مقبوضہ کشمیر سے دستبردار ہو جائے گا اور کشمیر کو آزادی مل جائے گی۔ مولانا فضل الرحمن کی جگہ ہم ہوتے تو ڈاکٹر مختار احمد کی خدمت میں عرض کرتے: حضور! یہ کارنامہ کل کی بجائے آج اور آج کی بجائے ابھی انجام فرما دیجیے، اندھے کو کیا چاہیے: ”دو آنکھیں“، پوری قوم ہمیشہ آپ کی شکر گزار ہوگی۔ لیکن مولانا عبدالملک نے رنگ میں بھنگ ڈال دی اور کہا: ”ڈاکٹر صاحب! کشمیر کسی دستاویز یا تحریر سے نہیں، جہاد سے آزاد ہوگا۔“ مولانا فضل الرحمن گہرا سمندر ہیں، سو وہ اس وار کو سہہ گئے اور خاموش رہے۔

یہ سطور لکھنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ مولانا زاہد الراشدی نے لکھا ہے: ”کیا اب فتویٰ حکومت دیا کرے گی، علماء اس سے دستبردار ہو گئے ہیں؟“۔ انہوں نے مزید لکھا: ”جب بنگلہ دیش کی پارلیمنٹ میں قادیانیت کے ارتداد کی قرارداد پیش ہوئی، تو پارلیمانی ارکان نے کہا: فتویٰ دینا پارلیمنٹ کا نہیں، علماء کا کام ہے۔“ پھر مولانا نے اس طرح تطبیق کی: ”فتویٰ علماء دیں گے اور قانونی و انتظامی نفاذ حکومت کرے گی۔“ مولانا زاہد الراشدی کی توجہ کے لیے عرض ہے: ”یہ تضاد اس دستاویز میں بھی موجود ہے، ایک طرف کہا گیا ہے کہ علماء صحیح غلط کی نشاندہی کر دیں، فتویٰ دینا حکومت کا کام ہے اور پھر اٹھارہ سو سے زائد علماء کا متفقہ فتویٰ اس میں شامل کیا گیا ہے،“ پس اگر یہ حکومت کا کام ہے تو علماء کو زحمت دینے کی کیا ضرورت ہے؟۔ جس طرح جرم کے درجات ہوتے ہیں، اسی طرح شرعی لحاظ سے باطل کا انتہائی درجہ کفر ہے۔ زمینی حقائق سے آنکھیں چرا کر خیالی کارنامے انجام دیے جائیں تو تضادات سامنے آتے ہیں۔ میں نے تو اس ساری کاوش کے پس پردہ قوتوں سے کہا تھا: آپ کو ملاؤں کی کیا ضرورت ہے، آپ کے پاس اپنی اسلامی نظریاتی کونسل ہے، اس کے ذریعے فتویٰ جاری کر دیجیے اور پھر آہ پارہ چوک پر کھڑے ہو کر عام لوگوں سے پوچھیے کہ انہوں نے اس کا کیا اثر لیا ہے۔“ علماء نے شرعی فتوے پر دستخط کیے ہیں، پیغام تو غالب اکثریت نے پڑھائی نہیں ہے۔

دوسری جانب افغان صدر جناب اشرف غنی نے کہا: ”ہمارے لیے بھی ایک ایسا ہی فتویٰ جاری کر دیجیے،“ سلیم صافی صاحب کے ساتھ پروگرام میں افغان سفیر عمر زخیلوال نے کہا: ”یہ فتویٰ اداروں نے دلویا ہے، ہمارے لیے بھی ایک ایسا ہی فتویٰ دلوا دیجیے۔“ اسی طرح تحریک لبیک پاکستان کے رہنما علامہ پیر محمد افضل قادری کا بیان نظر سے گزرا: ”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ علماء کفر کو کفر نہ کہیں۔“ میں نے ارباب اختیار سے کہا تھا کہ فتویٰ وہی مؤثر ہوتا ہے جو علماء اپنی تحریک پر اپنے پلیٹ فارم سے جاری کریں، مگر پشتو زبان کا محاورہ ہے: ”غریب ملا کی اذان پر کوئی کلمہ بھی نہیں پڑھتا۔“ ہمارے ہاں جس کام میں سرکار کا مرئی یا غیر مرئی سا یا نظر آ جائے، اس کے

بارے میں پہلے بدگمانیوں کا اظہار ہوتا ہے اور پھر وضاحتوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

ہم نے اپنے بیانے میں یہی لکھا تھا: ”مفتی کا کام دریافت کیے گئے سوال کا شرعی حکم بیان کرنا ہوتا ہے، قضا نہیں ہوتا، قضا عدالت کا کام ہے اور عدالت کا قیام ریاست کی ذمہ داری ہے، عدالت کا فیصلہ ریاست و حکومت کی طاقت سے نافذ ہوتا ہے، جبکہ معاشرے میں مفتی کے فیصلے یا فتوے کی پذیرائی اُس کے کردار، علمی حیثیت اور فقہی ثقافت کی بنیاد پر ہوتی ہے، اس کے پیچھے ریاست و حکومت کی کوئی قوت کارفرما نہیں ہوتی۔ ہم فتوے میں لکھتے ہیں: ”اگر مسائل کا بیان درست ہے تو اس کا شرعی حکم یہ ہے، نہ ہم شخصی حکم لگاتے ہیں اور نہ قضا کرتے ہیں، کیونکہ یہ ہمارا دائرہ اختیار نہیں ہے۔“ جن لوگوں کی خواہش ہے کہ مذہب کو معاشرے سے دیس نکالا دیا جائے، وہ اپنے دل میں یہ خواہش پال سکتے ہیں، لیکن لمحہ موجود میں اس کی تعبیر پانا مشکل ہے۔ حکومت مشکل میں ہو تو علماء کو مدد کے لیے پکارتی ہے اور حالات سازگار ہوں تو علماء قابلِ توجہ نہیں رہتے۔ ستمبر 2015ء میں وزیر اعظم ہاؤس میں ایک اجلاس ہوا، اس میں اس وقت کے وزیر اعظم، وزیر داخلہ، وزیر مذہبی امور، سول و دفاعی اسٹبلشمنٹ کے تمام اعلیٰ ذمہ داران موجود تھے، میں نے اپنی گفتگو کے دوران کہا تھا: بغیر محال کوئی مجھ سے یا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب سے یہ سوال کرے کہ ایک شخص کہتا ہے: ”العیاذ باللہ!“ اللہ ظالم ہے، تو اگر ہم یہ نہ کہہ سکیں کہ یہ کلمہ کفر ہے، تو پھر ہمیں اپنی مصروفیت کے لیے افتاء کے منصب کو چھوڑ کر کوئی اور کام اختیار کر لینا چاہیے، کفریات کو تو قرآن نے بھی بیان کیا ہے۔ البتہ اگر بلا سبب کسی کو کافر بنانے کا شوق ہو تو اس سے بڑا بد نصیب اور کون ہوگا۔

اصل کام عملی اقدامات ہوتے ہیں، جن کے نتائج ہر ایک کو نظر آتے ہیں، انگریزی کا محاورہ ہے: ”اعمال کی تاثیر الفاظ سے زیادہ ہوتی ہے۔“ کوئی ہمیں بتائے کہ حکومت نے اپنا ”دارالکفر“ کہاں قائم کر رکھا ہے، جہاں لوگ یہ جاننے کے لیے رجوع کریں کہ کسی شخص نے کفر کا ارتکاب کیا ہے یا نہیں، محض فیشن کے طور پر یہ کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ یہ ریاست کا کام ہے، اگر ریاست یہ کام انجام دے رہی ہے تو اس کا مقام کہاں ہے، حکومت کے لیے اور آفتیں کیا کم ہیں کہ ایک مزید آفت کو دعوت دے۔ ارتدادِ اقد یا نیت کے بارے میں جب پارلیمنٹ نے آئینی ترمیم کے ذریعے فیصلہ دیدیا تو اس کے بعد یہ باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ ہمارا اپنا تجربہ ہے کہ ہم دینی مدارس و جامعات کے بارے میں جب بالائی سطح پر بات کرتے ہیں، تو وہ اطمینان کا اظہار کرتے ہیں، ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ پھر آئے دن اپنے آپ کو کسی نہ کسی ایجنسی کا نمائندہ بنا کر کون مدارس کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے، ہر بار ایک ہی جیسی معلومات طلب کی جاتی ہیں۔ کیا ہماری ایجنسیوں کو ہمہ وقت ان کاموں میں مشغول رہ کر دشمن کی سازشوں کا کھوج لگانے اور انہیں بے اثر بنانے کے لیے وقت ملتا ہوگا۔ ہمیں بالائی سطح پر یہ یقین دہانی کرائی جاتی ہے کہ نہ کوئی ایسی ہدایت جاری ہوئی ہے اور نہ یہ پالیسی ہے، جبکہ برسرِ زمین یہ کارروائی ہو رہی ہوتی ہے، شاید یہی مشغلہ سیاست کے میدان میں بھی جاری رہتا ہوگا، اس پر قیاسات کے گھوڑے تو دوڑائے جاتے ہیں، لیکن نقشِ کف پا کسی کو نہیں ملتا۔

